حیات ندوی کی مخفی جہات

ڈاکٹر قاری محمد طاہر☆

اس موضوع سے چونک جانے کی ضرورت نہیں، نہ ہم نے یہ موضوع چونکا دینے کے لیے باندھا ہے، یوں بھی چونکنا اور چونکا دینا کچھ اچھی باتیں نہیں۔

مولانا ندوی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔لکھا جا تا رہے گا۔ہم نے اس موضوع کے حوالے سے آپ کی حیات مستعار کے ایسے پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے جن کو قلمکاروں نے غیر اہم خیال کیا اور صرف نظر سے کام لیا۔اور خود مولانا نے بھی ان پہلوؤں کو قلم کے ذریعے زبان تو دی لیکن اپنی دانست میں غیر اہم ہی سمجھا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی حیات کے یہ پہلو انسانوں کے لیے مشعل راہ بھی ہیں اور دلیل راہ بھی۔جن سے لوگ روشنی حاصل کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ روشنی مزید پھیلے گی اور ماحول کو اجالتی رہے گی۔

مولانا پر ان کی وفات سے قبل بھی بہت کچھ لکھا گیا وفات کے بعد تو اتنا کچھ سامنے آیا کہ وہ بجائے خود ایک مستقل علم کی حیثیت اختیار کر گیا۔مولانا کی ہر سعی خالصتاً لوجہ اللہ تھی۔آپ کا ہر عمل کلام الٰہی کی اس آیت کے مصداق تھا۔لا نرید منکم جزاءً ولا شکوراً

ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
بت خانہ بھی حرم بھی کلیسا بھی چھوڑ دے
سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل

☆ مدیر ماہنامہ التجدید فیصل آباد، مدیر اخبار رابطہ، ومرکزی رکن رابطہ عالمی رابطہ ادب اسلامی، پاکستان۔

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ان کا فکر، ان کی سوچ، ان کی رفتار، ان کی گفتار، طبعیت کی جولانی، قلم کی روانی، ان کا ہوش وگوش سب ایک ہی ہدف رکھتے تھے۔ اس ہدف کو الفاظ کا پیرہن دیا جائے تو صرف ایک ہی عنوان بنتا ہے یعنی اعلائے کلمۃ اللہ عیب جوئی اور خوردہ گیری رزائل اخلاق سے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں نفس امارہ کے لیے سامان لذت بھی ہے۔ مولانا کے دوست بھی بہت تھے اور ایسے بھی تھے جو ان کی ذات میں نقائص کی تلاش میں خوردبینی سے کام لیتے۔ مولانا کی عالی ظرفی تھی کہ تحقیر وتنقیص کرنے والے کو جواب نہ دیتے بلکہ واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما پر عمل کرتے۔

ان کے ایک قریبی عزیز کہتے ہیں کہ

''کوئی شخص مولانا کی تحقیر وتنقیص کرتا تو بھی مولانا اس کا جواب نہ دیتے اور اپنے معاونین ومحبین کو بھی ہدایت کرتے کہ وہ کوئی انتقامی رویہ اختیار نہ کریں اور ان سے ایسا آدمی ملتا تو وہ اس سے اس بات کی شکایت بھی نہ کرتے بلکہ شرافت نفس کے ساتھ معاملہ کرتے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ مولانا کو تنقیص وتحقیر کے رویے سے تکلیف نہ ہوتی تھی۔ وہ حساس طبیعت تھے۔ ان کو ایسی بات سے تکلیف ضرور ہوتی تھی لیکن انہوں نے اپنا وطیرہ برداشت اور رواداری کا رکھا۔ ایسے موقعوں پر عموماً وہ یہ شعر پڑھتے تھے۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است

با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا (۱)

مولانا اپنے عیب جو اور بدخو کو پہچانتے لیکن بظاہر Pose ایسا کرتے کہ آپ اس سے بالکل بے خبر ہیں۔ کبھی اشارے کنائے سے بھی تذکرہ نہ فرماتے۔

''آپ کے بعض بہی خواہ آپ کو مصلحتاً متعلقہ شخص کے شر سے بچانے کی غرض سے آپ کو مطلع فرماتے تو پتہ چلتا کہ آپ فراست مومنانہ سے متصف ہیں اور ہر بات کی جزئیات کو سمجھ رہے ہیں لیکن طبعی استغناء اور فاعفو او اصفحوا کے جذبے پر عمل پیرا ہیں'' (۲)

ایک شخص مولانا کے ساتھ کدر رکھتا تھا اس نے کسی سے کہا کہ وہ مولانا کے خلاف مواد جمع کر کے کتاب لکھے، سارا خرچہ میں ادا کروں گا۔ چنانچہ زر کثیر خرچ کر کے اس نے آپ کے

خلاف کتاب لکھوائی اور ایک قاصد کے ذریعہ مولانا کو بھیجی ۔ مولانا نے کتاب کا مطالعہ کیا اور فرمایا:

''اگر آپ ہمارے خلاف ایسی دس مزید جلدیں بھی لکھیں، تب بھی آپ کو جواب نہ ملے گا۔ پھر آپ نے امام ابن تیمیہ کا حوالہ دیا کہ اصل چیز مثبت اور تعمیری کام ہے'' (۳)

مولانا کا خاندانی پس منظر ایسا ہے کہ جہاں دینی علوم کی رغبت کی بجائے مغربی تہذیب کی چھاپ نظر آتی ہے چنانچہ آپ کے خالہ زاد اور رشتہ کے چچازاد بھائی سید محمد احمد ۱۹۱۵ء میں انگلستان سے برسٹری کا امتحان پاس کر کے آئے ۔ آپ کے حقیقی ماموں زاد بھائی سید سراج النبی حسنی ۱۹۲۱ء میں امریکہ گئے، جبکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ جانے کا اس زمانے میں خیال تک نہ تھا ۔ اسی طرح آپ کے ایک اور رشتہ دار سید محمد عمر حسنی جرمن اور جاپان سے انجینئرنگ کے شعبہ میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر چکے تھے ۔ انہوں نے نیویارک کے ایک کالج سے کامرس کی ڈگری بھی لی ۔

آپ کے ایک رشتہ دار سید اسحاق حسنی، انڈین سول سروس میں (I.C.S) منتخب ہوئے اور لندن سے تربیت لے کر لوٹے (۴) ۔

اس خاندانی پس منظر میں مولانا کا دینی علوم کی طرف رغبت رکھنا انتہائی اہمیت کا حامل ہے ۔ آپ نے اپنی زندگی میں اس ماحول کا اثر قبول نہ کیا، بلکہ خالصتاً دینی اور مشرقی علوم کی طرف اپنی طبعیت کو راغب رکھا ۔ آپ اپنے بچپن کے واقعات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس بچپن کی دوسری بات جو یاد آتی ہے، وہ اپنے حقیقی خالہ زاد اور رشتہ کے چچازاد بھائی سید محمد احمد صاحب بیرسٹر کی شخصیت ہے، وہ ۱۹۱۵ء میں سیلاب سے کچھ پہلے انگلستان سے بیرسٹری پاس کر کے اور فلسفہ میں ایڈمبرا یونیورسٹی سے ایم ۔ اے کر کے آئے تھے، ان کی آمد پر اس چھوٹے سے خاندان، اور چھوٹی سی بستی میں بڑا استقبال اور اہتمام کیا گیا تھا کہ اس وقت شاید پورے ضلع میں کم سے کم مسلمان شرفاء اور زمینداروں کے خاندانوں میں شاید ہی کوئی یہ اعزاز حاصل کر کے آیا ہو، یہ تو میرے شعور سے پہلے کی بات ہے، میں نے اس مسرت اور استقبال کے قصے سنے ہیں، جو ان کے پہونچنے پر دیکھنے میں آیا، یہ زمانہ انگریزی اقتدار اور اس کی تہذیب کے اقبال وعروج کا زمانہ تھا، ہر اس چیز کو عزت ومرعوبیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے

،جس کا اس قوم اور ملک سے انتساب ہو، اس زمانہ میں انگلستان کو ''ولایت'' کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا، ''فلاں آدمی ولایت سے آیا'' وہ ''ولایت کا پاس ہے'' ''ولایت ایسا ہوتا ہے'' آج بھی کان میں آوازیں گونج رہی ہیں کہ ملازم دروازے پر آواز دے رہے ہیں کہ ''صاحب'' یہ مانگ رہے ہیں، ''صاحب'' یہ کہہ رہے ہیں، ان کا اپنے کتوں کے ساتھ شکار کو جانا اور بچوں اور عزیزوں کے جلوس کا ہمراہ ہونا آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے، اس کا ذکر اس لیے بھی کیا گیا کہ اس سے اس زمانہ کی انگریزی تعلیم وتہذیب کے اثرات، اور اس قوم کے اقبال کا بھی اندازہ ہو، جس کا سحر تحریک خلافت، اور تحریک آزادی تک دلوں اور دماغوں پر قائم رہا، اور جس سے مشکل سے کوئی کھاتا پیتا، اور پڑھا لکھا خاندان مستثنیٰ ہوگا۔

بھائی صاحب محمد احمد صاحب کے بعد خاندان کیا، بلکہ گھر کے دوسرے نوجوان جو تعلیم کے لیے ہندوستان سے باہر گئے میرے حقیقی ماموں زاد بھائی سید سراج النبی حسنی تھے، جو ۱۹۲۱ء میں عازم امریکہ ہوئے، اس وقت تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ جانے کا شاید پورے ہندوستان میں بہت کم رواج ہوگا، اس لیے کہ ہندوستان میں صرف انگلستان ہی کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کی سندیں معتبر اور ملازمتوں کے حصول کی ضامن تھیں، یہ معلوم نہیں ان کو کوامریکہ کا خیال کیسے آیا، ان کے اس سفر سے کچھ پہلے ہمارے ایک دوسرے عزیز بزرگ سید محمد عمر حسنی صاحب جرمنی اور جاپان جا چکے تھے، اور وہاں سے انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگریاں لائے تھے''۔ (۵)

مولانا کے اعزہ اچھے عہدوں پر فائز رہے جن میں ایک حافظ سید اسحٰق حسنی بھی تھے جو آئی سی ایس افسر تھے اور سابق مشرقی پاکستان میں چیف سیکرٹری کے عہدہ پر فائز رہے پھر کراچی منتقل ہو گئے۔ (۶)

اس خاندانی پس منظر اور معروضی ماحول کے باوجود مولانا کا دینی علوم کی طرف راغب ہونا انتہائی اہم ہے۔ یہاں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ انگریزی ماحول سے دینی ماحول کی طرف راغب رکھنے میں آپ کی والدہ محترمہ کا بڑا کردار ہے۔ اس حوالے سے مولانا لکھتے ہیں:

''جب مجھ پر انگریزی پڑھنے کا دورہ پڑا اور اس کا بخار چڑھا، میں نے میٹرک کے کورس کی کتابیں خرید لیں، ریاضی محلّہ کے ایک استاد سے پڑھنے جاتا تھے، جب وہ لکھنؤ سے منتقل ہو گئے تو میں نے بطور خود مطالعہ کرنا شروع کیا، اور اپنے شوق سے انٹرمیڈیٹ کے معیار کی کتابیں (جو اب شائد بی، اے کے معیار کی ہوں گی) ڈکشنری سے حل کر کے مطالعہ کرنے لگا، ابھی امتحان میں بیٹھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ والدہ صاحبہ کو (غالبًا بھائی صاحب کے ذریعہ) میرے اس انہماک کا علم ہوا، انہوں نے بڑے مؤثر اور دردمندانہ خط لکھے'' (۷)

آپ کی والدہ نے ایک خط میں لکھا

''علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ، اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو، اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو، تو ان مردوں پر نظر کرو، جنہوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گزادی، ان کے مرتبے کیا تھے، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب، مولوی ابراہیم صاحب، اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحب، اور مولوی محمد امین صاحب، جن کی زندگی اور موت اس وقت قابلِ رشک ہوئی کس شان وشوکت کے ساتھ دنیا برتی، اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی، یہ مرتبے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں، انگریزی مرتبے والے تمہارے خاندان میں بہت ہیں، اور ہوں گے، مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں، ....علی! اگر میرے سو اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں، اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک نام ہوں، اور صاحب اولاد کہلاؤں، آمین ثم آمین یارب العالمین''۔ (۸)

مولانا کے والد طبیب تھے اس لیے آبائی پیشہ کے طور پر یہی پیشہ اختیار کرنا ایک رواجی مفہوم اور امر طبعی تھا۔

''تمام قرائن وآثار اس بات پر دلالت کرتے تھے، کہ میں تکمیل تعلیم کے بعد طب پڑھوں گا، اور آبائی ذریعہء معاش اختیار کروں گا، کچھ روز بھائی صاحب نے مطب میں بٹھایا بھی اور نسخے بھی لکھوائے، مولانا سید طلحہ صاحب سے طب کی ایک ابتدائی کتاب ''نفیسی یا سدیدی'' شروع بھی کی، مگر بھائی صاحب کو جلد اس کا اندازہ ہو گیا کہ مجھے طب سے مناسبت نہیں

،اس لیے اس کو موقوف کیا''۔(۹)

اصل بات یہ تھی کہ اللہ نے آپ سے کچھ اور ہی کام لینا تھا۔ اس لیے آپ معروضی ماحول اور دیگر طبعی مشاغل سے مجتنب رہے۔ قدرت نے آپ کو ایک ایسی روش پر گامزن رکھا جو دینی حوالہ سے انتہائی اہم اور وقت کی ضرورت تھی۔

کتب بینی اور کتب چینی کا شوق شعور اور ادراک کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے ہی آپ کی طبیعت کا حصہ بن چکا تھا۔ بچپن میں آپ کے کھیل بھی کتابوں ہی کے حوالے سے تھے۔ اسی دوران آپ نے اپنا ایک کتب خانہ بھی قائم کیا لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ کتب خانہ کتب کی فروخت کی غرض سے تھا یا محض ذاتی لائبریری۔ آپ لکھتے ہیں:

''والد صاحب کا ماحول چونکہ بالکل علمی وتصنیفی تھا، وہ بکثرت اپنی ضرورت سے کتابیں منگواتے اور مصنفین بھی ان کو بھیجتے تھے بہت سی کتابیں اور رسائل ایسے ہوتے تھے، جن پر وہ ایک نظر ڈال کر ان کو وہ ایک طرف رکھ دیتے تھے، میں اس انبار سے (جو والد صاحب کے لیے بیکار تھا) رسالے فہرستیں وغیرہ چھانٹ کر لے جاتا، صحن میں ایک کھلی الماری تھی، اس میں ان کو سجاتا، ایک چھوٹا سا بورڈ بنایا تھا، جس پر لکھا تھا، ''کتب خانہ ابوالحسن علی'' مجھے اب بھی یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں رو رہا تھا یا کسی بات پر ضد کر رہا تھا، والد صاحب نے اپنے پیش کار مولوی سید عبدالغفور صاحب شرر التھانوی ندوی مددگار ناظم ندوۃ العلماء کو بلایا تھا، وہ زینے پر کھڑے تھے، والد صاحب نے ''گلِ رعنا'' کا مسودہ جو اس وقت مکمل ہوا تھا، ان کے حوالہ کیا، اور ہدایت کی کہ وہ مولوی سید سلیمان (مولانا سید سلیمان ندویؒ) کو اعظم گڑھ بھیج دیا جائے، مسودہ حوالہ کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ چپ ہو جاؤ میں اس کتاب میں تمہارا نام چھپواؤں گا، خدا کی شان کہ آج ان کی وفات کو تقریباً ۶۰ برس کے بعد اس کی نوبت آرہی ہے کہ ''گلِ رعنا'' کے پانچویں ایڈیشن کی اشاعت پر (جو زیر تیاری ہے) میرا اس کتاب پر تبصرہ اور ''آبِ حیات'' سے موازنہ بطور مقدمہ شائع ہوا''۔(۱۰)

مولانا اپنی کتب بینی کے شوق اور سادگی طبع کا ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ:

''میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کتب فروشوں ہی کے یہاں ملتی

ہے، اور ہر چیز کی دوکان الگ ہوتی ہے، میں امین آباد گیا، گھنٹہ گھر والے پارک کے سامنے بڑی دوکانوں کی جو قطار ہے، اس میں کسی دوا فروش کی دکان پر پہونچا، غالباً ''سالومن'' کمپنی تھی، میں نے پیسے بڑھائے کہ کتاب دیجئے، دوکان پر کام کرنے والے صاحب نے سمجھا کہ کسی شریف گھرانے کا بھولا بھالا بچہ ہے، کیمسٹ کی دوکان پر کتاب کیا ملتی، دواؤں کی فہرست اردو میں تھی، انہوں نے وہی بڑھادی، اور پیسے بھی واپس کردئے، میں پھولے نہیں سماتا تھا کہ کتاب بھی مل گئی اور پیسے بھی واپس آ گئے''۔(۱۱)

مولانا بچپن ہی سے مبلغانہ انداز رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنے بچپن کا واقعہ لکھتے ہیں۔

''اس وقت کی بات خوب یاد ہے کہ چونکہ لوگ والد صاحب سے خوب واقف تھے، اور ان کو ایک عقیدت اور محبت تھی، میں ان کا فرزند تھا، اس لیے کوئی مجھ سے وعظ کہنے کی فرمائش کرتا، کوئی نبض دکھاتا، اور نسخہ پوچھتا، کہ والد صاحب عالم بھی تھے، اور طبیب بھی، میری عمر مشکل سے ۶۔۷ سال کی تھی، وعظ کی فرمائش پر میں قرآن شریف کی آیت:

یایھا الذین اٰمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا (التحریم۔۶)	اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور گھر والوں کی دوزخ سے۔

پڑھ کر اس کا ترجمہ کرتا، پھر کوئی نبض دکھاتا اور کہتا کہ حکیم جی نسخہ بتائیں، میں نسخہ بولتا، گلِ بنفشہ، گاؤ زباں، عناب ولایتی تخم خبازی، تخم خطمی، پرہیز پوچھنے پر شوربہ، پھلکا بتاتا، یہ معلوم نہیں یہ سبق کس نے یاد کرایا تھا، والد صاحب کے مطب میں سیکھا تھا، یا کسی نے رٹا دیا تھا، اب جب کبھی دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے دینی تعلیم کی ضرورت واہمیت پر تقریر کرتے ہوئے، اس آیت کو پڑھتا ہوں، تو بے اختیار وہ زمانہ یاد آجاتا ہے، اور دل حمد وشکر کے جذبات سے لبریز''۔(۱۲)

مولانا عین القضاۃ نقشبندی مجددی کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں آپ نے لکھنؤ میں قرأت کا مستند ومعروف مدرسہ قائم کیا تھا۔ جملہ اکابر قراء وہاں کے فیض یافتہ ہیں یا فیض بخش ہیں۔ برصغیر کے معروف قاری عبدالمالکؒ اسی مدرسہ میں مسند تدریس پر فائز رہے۔ مولانا ندوی ان کا دم کردہ پانی پیا کرتے تھے۔ آپ لکھتے ہیں

''اس موقعہ پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ میں بچپن میں اکثر بیمار رہتا، پانی کسی برتن میں بھر کر کے

حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحب نقشبندی مجددی کی خدمت میں جاتا، اور وہ دم کرتے، اس طرح میں نے ان کا دم کیا ہوا پانی پیا ہے، کیا عجب ہے کہ ان کے انفاس متبرکہ کا کوئی اثر حصہ میں آیا ہو''۔(۱۳)

آپ کو سیرت رسولؐ کے ساتھ وابستگی بچپن ہی سے تھی۔ بچپن میں آپ سیرت کے حوالے سے شعر شوق سے سن کر یاد کر لیتے۔ فرماتے ہیں:

''اسی زمانہ کا سنا ہوا حضرت حلیمہ دائی کا قصہ آج تک دل پر نقش ہے، اس کے ابتدائی چار شعر یہ ہیں۔

ایک عاشق تھی حلیمہ دائی — جس نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی
وہ کچھ اس رمز سے آگاہ نہ تھی — اس کی قسمت میں یہ دولت تھی لکھی
نور اللہ کو لائی گھر میں — یعنی اس شاہ کو لائی گھر میں
واہ کیا طالع بیدار ملے — جس کو کونین کے سردار ملے

اس سیدھی سادی نظم میں جس کے کہنے والے کا نام بھی معروف نہیں، اس پاک محبت نے دل کی نرم سرزمین میں ابتدائی بیج ڈالے، پھر جب ''سیرۃ ابن ہشام'' میں یہ عزیز ولذیذ حکایت پڑھی جس میں راوی نے اپنے معمول سے زیادہ درازنفسی سے کام لیا ہے۔

لذید بود حکایت، دراز تر گفتم

تو وہ معصوم زمانہ جس پر اللہ کی ہزار رحمتیں ہوں یاد آ گیا۔(۱۴)

سیرت سے جو تعلق آپ کو تھا، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ آپ بچپن ہی میں سیرت کے جلسے کراتے۔ لکھتے ہیں:

''اس زمانہ کے رواج کے مطابق مجھے میلاد یا سیرت کا جلسہ کرنے کا شوق ہوا، اپنے ہم سن بچوں کو مدعو کیا، اور ان کو دعوت دینے کے لیے خود گھر گھر گیا، انہیں بہنوں میں سے کسی نے میرے سر پر پگڑی باندھی، عمر یہی آٹھ، نو برس کی رہی ہوگی، انہیں کتابوں میں سے کوئی کتاب لے کر پڑھنی شروع کی، قابلیت کا یہ حال تھا کہ حضورؐ کے دادا سردار قریش عبدالمطلب کو عبد المطلب پڑھ رہا تھا، والد مرحوم خاموشی سے آ کر ایک طرف اوٹ میں کھڑے ہو گئے تھے، ان کا دل یہ منظر دیکھ کر کتنا باغ باغ ہو رہا ہوگا کہ اللہ نے عشق نبویؐ کا ان کو حصہ وافر عطا فرمایا تھا، اور

اسی سے ان کی تحریروں میں آب و رنگ ہے، ان کے لیے کیا کم خوشی کی بات تھی کہ ان کا کم سن بچہ اس ذکر خیر میں مصروف ہے''۔ (۱۵)

سیرت رسول ﷺ کے ساتھ یہ تعلق بچپن سے شروع ہوا اور دم واپسیں تک رہا آپ کی کتاب ماذا خسر العالم میں ایک مضمون محمد رسول اللہ روح العالم العربی کے عنوان سے ہے۔ بلاشبہ کتاب کا یہ حصہ انتہائی اہم اور جاندار، قابل قدر حصہ ہے۔ جس میں آپ نے اپنی تمام تر قلمی صلاحیتوں سے کام لیا ہے۔ آپ کو اپنی اس تحریر پر بڑا ہی سعادت مندانہ فخر تھا۔ اس حوالہ سے آپ لکھتے ہیں:

''اگر کسی بدعت اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو مصنف وصیت کر جاتا کہ کتاب کے یہ صفحات ان کے کفن میں رکھ دیئے جائیں کہ وہ ان کو اپنے لیے مغفرت اور وسیلہء شفاعت سمجھتا ہے''۔ (۱۶)

حیات ندوی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ کو لڑکپن میں ہاکی کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ اور آپ نے ہاکی بہت کھیلی، کھیل کے میدان اور کھلاڑیوں کی گفتگو جس انداز کی ہوتی ہے عیاں ہے۔ کھیل کے ایام میں طبعی عمر کے لحاظ سے لاابالی پن زیادہ آجاتا ہے، مولانا ہاکی کھیلتے لیکن اخلاق سے گری باتوں سے نفرت کرتے۔ آپ کی اس طبیعت کا اثر دوسرے کھلاڑیوں پر ہوا۔ اور وہ آپ کا لحاظ کرتے تھے اور آپ کی موجودگی میں کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالتے جو اخلاق سے گری ہوئی ہو۔ مولانا لکھتے ہیں:

''بازار چھاؤلال کے اسی دوبارہ قیام کے زمانہ میں (۱۹۲۶ء۔۱۹۲۸ء) مجھے ہاکی کھیلنے کا شوق کیا لت ہوئی، قریب ہی روشن الدولہ کچہری کے عقب میں راجہ نواب علی روڈ پر ایک کھلا میدان تھا، جہاں اب اسٹیٹ ریڈ کراس سوسائٹی کی عمارت ہے، وہاں ایک کلب قائم تھا، اس میں میں اور بھائی ابوبکر کھیلنے جانے لگے، ابوبکر شروع سے ہاکی کے اچھے کھیلنے والوں میں تھے، اور بعد میں تو وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے ممتاز کھلاڑی، اور ٹورنامنٹ میں حصہ لینے والی ٹیم کے ممتاز کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے، میں متوسط درجہ کے کھیل سے آگے نہ بڑھ سکا، اس میں میری اس بے وقت عقلیت کو بھی دخل تھا، جو کھیل کی روح کے سخت منافی اور اس میں ترقی کرنے سے مانع

ہے، یعنی گول کرنے نہ کرنے، اور جیتنے نہ جیتنے کی اہمیت اور جوش کا فقدان، اس کلب میں آنے جانے سے مجھے (جس کا زمانہ ابھی تک تکیہ کے ماحول، یا بھوپال ہاؤس کی فضا میں گذارا تھا) باوجود کم سنی کے اندازہ ہوا کہ اسکولوں کالجوں، اور محلوں کا ماحول، اور اس وقت کا مسلم معاشرہ کتنا فاسد ہو چکا ہے، اس کلب مین زیادہ تر قریب کے محلّہ پیر جلیلوں اور گولہ گنج کے نوجوان اور لڑکے شریک ہوتے تھے، جن میں ایک تعداد شیعہ سنی لڑکوں، اور ایک تعداد کرسچین لڑکوں کی بھی تھی، مین ان کی زبان سے ایسے الفاظ نکلتے ہوئے سنتا، جو اخلاقی بگاڑ اور معاشرہ کے فساد بلکہ تعفن کی غمازی کرتے تھے، بعض اوقات وہ ہم دونوں کو آتے ہوئے دیکھ کر خاموش ہو جاتے، پھر بھی کان میں ان کی باتیں پڑتی رہتی تھیں، میری عمر کا یہ زمانہ جو عربی اصطلاح میں ''مراہقہ فکری وجسمانی'' کا زمانہ تھا، بڑا آزمائشی اور ایک حد تک تاریک زمانہ تھا، اور اقبال کے الفاظ میں (قدرے ترمیم کے ساتھ)

نشستم با نکو یانِ فرنگی

ازاں بے سوز تر روزے مدیدم

مولانا کی عمر تقریباً تیرہ برس کی تھی، کہ ان کا ایک مضمون برّصغیر کے معروف اخبار ''زمیندار'' میں شائع ہوا۔ زمیندار پورے ہندستان میں بہت رغبت سے پڑھا جاتا تھا۔ اس اخبار میں مضمون کا شائع ہو جانا معمولی بات نہ تھی۔ زمیندار میں مولانا کا مضمون ابوالحسن علی ندوی پسر مولانا حکیم سید عبدالحئی کے نام سے شائع ہوا۔

اتفاق سے مولانا اپنے ایک دوست مولوی ابو بکر کے ہمرہ رائے بریلی سے لکھنؤ جارہے تھے۔ ابو بکر کی عمر بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔ نابالغ کا ٹکٹ چونکہ ریل میں آدھا ہوتا ہے۔ دونوں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھایا اور آدھے آدھے ٹکٹ خرید لیے۔ راستے میں ٹکٹ چیکر آ گیا اس نے ٹکٹ چیک کیے اور مولانا سے عمر پوچھی۔ جواب ملا تیرہ برس۔ وہ ٹکٹ چیکر تحکم سے بولا۔ تمہاری دونوں کی عمریں حد بلوغ سے بڑھ چکی ہیں اب آدھا ٹکٹ نہیں چلے گا۔ لہٰذا بقیہ پیسے اور اس کے ساتھ جرمانہ بھی ادا کرو۔ مولانا نے چیکر کی دھمکی سنی تو مولانا لکھتے ہیں:۔

''ذرا مشورہ کرلوں، اتنے میں میں نے ''زمیندار کا پرچہ نکالا، مسافر بیکار بیٹھے ہوتے

ہیں، پرچہ نے گشت کرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ ٹی، ٹی، آئی صاحب کی باری آئی، وہ اخبار دیکھ رہے تھے میں ان کے پاس گیا اور میں نے اپنے مضمون کی طرف متوجہ کر کے کہا کہ یہ مضمون میرا ہے، اتفاق سے وہ مسلمان تھے، اور وردی کی وجہ سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا، انہوں نے کہا کہ کیا تم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے بیٹے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، انھوں نے کہا کہ میں ندوہ کا پرانا طالب علم ہوں، وہ میرے زمانے میں ندوہ کے ناظم تھے، جاؤ تم سے کچھ نہیں لوگا۔ اس طرح اپنے مضمون کی برکت اور تھوڑی سی زیرکی سے ہم دونوں جرمانہ سے بچ گئے (۱۸)

مولانا کو اپنے دور کے مشاہیر سے ملنے کا اشتیاق ہوتا تھا کیونکہ مشاہیر سے ملاقات بجائے خود علمی استفادہ کا سبب ہے۔ جب آپ پہلی مرتبہ بغرض تعلیم لاہور تشریف لائے تو آپ نے جہاں دیگر اہل علم سے ملاقات کی وہاں فن کشتی کی مشہور زمانہ شخصیت گاماں پہلوان سے بھی ملے۔ (۱۹)

ظاہر ہے کہ آپ اس بات سے متاثر ہوئے ہوں گے کہ یہ شخص دنیا کا طاقتور ترین انسان ہے اور دنیا میں طاقتور ترین بن کر رہنا چاہیے۔ اسی محرک نے آپ کو علمی دنیا کا رستم زماں بنا دیا۔ یوں بھی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قیادت و سیاست کو دو شرائط سے مشروط کیا ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

فزادہ بسطة فی العلم والجسم یعنی علمی اور جسمانی لحاظ سے مضبوط ہونا۔

مولانا علیؒ جو رستم زماں گاماں پہلوان سے ملتے ہوئے بسطۃ فی الجسم کے سامنے کھڑے تھے اور بسطۃ فی العلم بننے کا داعیہ لے کر جدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی و قلمی دنیا کا بڑا انسان بنا دیا۔

یونیورسٹیوں میں ہر وقت استاد نہ ملنے کی شکایت آج کی نہیں بہت پرانی ہے۔ لوگ انگریز کے دور کو اچھا خیال کرتے ہیں لیکن یہ مرض سابقہ دور ہی سے یونیورسٹیوں کا حصہ چلا آ رہا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''فاضل حدیث کا امتحان تو میں نے بغیر مطالعہ اور محنت کے دے دیا اور کامیاب ہوا، لیکن اس وقت اتنا احساس پیدا ہو گیا تھا کہ اس کی سند نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی آج تک

نہیں لی''۔(۲۰)

آپ نے شعور وادراک کی عمر میں قدم رکھا تو برصغیر میں بدیسی حکمرانوں کو دیکھا۔ آپ کو طبعی طور پر یورپی معاشرے سے نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ اور مروجہ تعلیم کے حصول کے باجود آپ کو یہ پسند نہ تھا کہ کوئی غیر مسلم آپ کو کوئی اعزاز بخشے۔ آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور کامیابی حاصل کی اور انگریز گورنر کے ہاتھوں کانووکیشن میں سند حاصل کی لیکن انگریز گورنر سے ڈگری کی وصولی آپ کی طبیعت پر ناگوار گزری، آپ لکھتے ہیں:

''اسی سال دسمبر ۱۹۲۹ء کو یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد (convocatiaon) میں گونر یو۔پی سر مالکم ہیلی نے سندیں تقسیم کیں، اور میں نے بھی اپنے ساتھیوں سید ابوبکر وغیرہ کے ساتھ سند لی، اور یہ ستم ظریفی میری زندگی میں پیش آکر رہی کہ عربی ادب اور اردو زبان کی سند ایک انگریز حاکم، اور دشمن اسلام قوم کے فرد سے لی جائے، لیکن ہر چیز کو اپنے زمانہ وماحول کے پیمانے میں ناپنا چاہیے، اس ماحول میں یہ چیز معیوب نہیں سمجھی جاتی تھی، اور اقبال کا یہ شعر بھی شاید کان میں نہیں پڑا تھا۔

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی (۲۱)

امانت کا عام تصور یہی ہے کہ اگر کوئی چیز کسی کے پاس امانتاً رکھی جائے تو عند الطلب وہ چیز من وعن واپس لوٹا دی جائے، لیکن مولانا کے ہاں امانت وسیع المعنی لفظ ہے۔ آپ کے نزدیک کسی شخص سے کسی بھی انداز کا استفادہ بھی امانت ہی تھا۔ آپ کے ایک قریبی شاگرد لکھتے ہیں

''ادب عربی میں اپنا خاص مقام رکھنے اور فن کی باریکیوں میں مہارت کے باجود ایک دفعہ مولانا نے بلاتردد طلبہ کے سامنے بیان کردیا کہ کسی بات پر زور دینے کے لئے عربی میں کیا تعبیر اختیار کی جاتی ہے اس کو انہوں نے عربی عالم کی زبان سے ایک کانفرنس کی ذیلی کمیٹی کے دوران اخذ کیا اور آپ نے پورا قصہ سنایا، الارکان الاربعہ کے دوران جب کوئی نادر تعبیر آتی ہے تو آپ اس کی خوبیوں کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ یہ تعبیر کہاں سے لی ہے''۔(۲۲)

مولانا کا شہری تعلق بھارت کے ساتھ تھا لیکن وہ بھارتی شہریت رکھنے کے باجود پاکستان کے ساتھ قلبی وابستگی رکھتے تھے کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے اور اسلام کے لیے معرض وجود میں آیا ہے۔

مولانا کے دل میں پاکستان کی محبت حد درجہ رچی بسی تھی وہ اس ارض پاک کو اسلام کا قلعہ دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے۔اس کا ثبوت ان کی وہ تقاریر ہیں جو آپ نے سفر پاکستان کے دوران مختلف مقامات پر کیں۔ پھر ان کو حدیث پاکستان کے عنوان سے کتابی شکل دی۔مولانا اس کتاب کو پاکستان میں جلد شائع کروانے کی تمنا رکھتے تھے۔اس پر انہوں نے بار بار جناب فضل ربی کو متوجہ کیا۔کتاب چھپی تو آپ مطمئن نہ تھے۔چنانچہ آپ نے لکھا:

''شاید تم نے ہماری کتاب ''حدیث پاکستان'' کی پوری اہمیت محسوس نہیں کی، اس میں ہمارے تجربہ اور مطالعہ کا نچوڑ آ گیا ہے، اور جو مخلصانہ مشورے دیئے جا سکتے تھے وہ دیئے گئے ہیں، اس کی بار بار اشاعت کی ضرورت ہے''۔(۲۳)

پاکستان میں ایوبی دور ہر لحاظ سے اہم دور ہے۔اسی دور میں نظریہ انکار حدیث کو پنپنے کا خوب موقعہ ملا۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ غلام احمد پرویز بیشتر معاملات میں حکومت وقت کی ہاں میں ہاں ملاتے اور حکومت کے ہر اقدام کی قرآن حکیم سے شرعی سند دیتے تھے۔حکومت غلام احمد پرویز سے بہت خوش تھی اور ہر طرح کی رعایت انہیں دیتی تھی۔

مولانا اسلامی ممالک میں جیسی صورت حال دیکھتے اس کے مطابق اس ملک کے لیے تحریر لکھتے۔ چونکہ مقصد صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور اصلاح احوال تھا اس لیے اس کتاب کو اسی ملک میں زیادہ اشاعت پذیر کرنے کی فکر فرماتے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اسلامی مزاج کی تشکیل میں حدیث کا بنیادی حصہ'' بہت ضروری مضمون تھا، اس کو پاکستان میں ضرور چھپنا چاہئے، کہ انکار حدیث کا فتنہ اصل میں وہیں کی پیداوار ہے اور یہ اس کا مسکت جواب ہے''۔(۲۴)

اپنے اساتذہ کی عزت واحترام تو ہر کس وناکس کے دل میں ہوتی ہے، لیکن مولانا ندوی کا یہ وصف تھا کہ آپ نہ صرف اپنے اساتذہ کی حد درجہ عزت فرماتے، بلکہ اپنے اساتذہ کی

اولاد تک کو وہی عزت وتوقیر عطا کرتے تھے۔ مولانا کے ایک استاد مولانا خلیل بن محمد بن عرب تھے۔ ان کی صاحبزادی عطیہ خلیل عرب، کراچی آباد ہیں۔ اتفاق سے انہوں نے ہندوستان کے سفر کا ارادہ کیا۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔ اس حوالے سے انہوں نے ایک خط فضل ربی ندوی کو لکھا۔ فرماتے ہیں:

''ہمارے سب سے بڑے محسن ومربی استاد مولانا خلیل بن محمد عرب صاحب مرحوم کی صاحبزادی عطیہ خلیل عرب جو کراچی یونیورسٹی میں عربی کی پروفیسر ہیں وہ ہندوستان آرہی ہیں، یہاں رائے بریلی میں ایک اصلاحی ودینی سیمینار ہے اس میں شرکت کریں گی ہمارے گھر والوں سے اور ہم سب سے ملیں گی اور قدیم وطن بھوپال بھی جائیں گی، جہاں ان کے بہت سے اعزہ ہیں۔ ویزا کے حصول کے لیے ان کو انگریزی میں دعوت نامہ بھیجا جارہا ہے، لیکن ان کا یہ سفر ہمارے خرچ پر ہوگا۔ تم لکھنؤ تک کے ہوائی سفر کے لیے ہماری طرف سے انتظام کردو۔ اس کے حساب سے رقم پیش کردو یا ٹکٹ خرید کر کے دے دو یہ ہمارے ذاتی حساب میں ہوگا مجلس کی رقم میں نہیں ہوگا۔ ہم یہ رقم تم کو کسی معتبر ذریعے سے جدہ یا لکھنؤ سے پہنچا دیں گے۔ تم رقم کی مقدار لکھ دینا۔ ان شاء اللہ وہ تم کو مل جائے گی۔ اس سفر کے انتظام میں تھوڑی مدد بھی کردینا۔ ہم تمہارے شکر گزار ہوں گے۔ وہ ہماری بہت عزیز بہن ہیں اور ہماری ساری عربی دانی اور اس سلسلے میں کامیابی کا سہرا ان کے والد صاحب مرحوم کے سر ہے۔ (۲۵)

ندوۃ العلماء کا مقصد ایسے علماء تیار کرنا تھا جو قدیم وجدید جملہ علوم سے واقفیت رکھنے والے ہوں۔ چنانچہ ندوہ میں پڑھائے جانے والے نصاب کو جدید سے جدید خطوط پر استوار کیا جاتا تھا۔ عربی ادب سے طلباء کو روشناس کرانے کی غرض سے ابتداء میں القرأۃ الرشیدہ اور حکایات الاطفال کو شامل نصاب کیا گیا۔ یہ کتب اگرچہ عربی ادب جاننے کے لیے تو مفید تھیں تاہم ان میں ایک بنیادی خامی یہ تھی کہ ان کا ہدف دینی اور اخلاقی تعلیم نہ تھا محض عربی دانی مقصد تھا اور پھر ان کے ہر صفحہ پر تصاویر بھی بنی ہوئی تھیں۔ جن کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا مولانا کی خواہش تھی کہ عربی ادب سے روشناسی کی غرض سے ایسی کتب تیار کی جائیں جو مندرجہ بالا اسقام سے مبرا ہوں چنانچہ آپ نے ''مختارات من ادب العرب'' کے نام سے ایک مجموعہ تیار کیا

جس میں عربی ادب کے اعلیٰ شاہ پاروں کو ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ کتاب آپ نے ۱۹۴۰ء میں مکمل کی اور ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ حتیٰ کہ دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ کے ادب عربی کے نصاب میں اس کو شامل کیا گیا۔ عالم عرب کے مشہور ادیب علی طنطاوی نے اس کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا:

''اگر کسی ادیب کے ذوق کی دلیل اس کا انتخاب ہے تو قارئین کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم نے کچھ عرصہ ہوا ادبی منتخبات اور نمونوں کے مجموعوں کو جمع کیا تا کہ ان میں سے کسی کو ثانویۃ شرعیہ کے طلباء کے سامنے رکھیں، ہماری کمیٹی کے ممبران نے (جو سب ادبا میں سے تھے) علیحدہ علیحدہ تلاش وجستجو شروع کی، اور اس موضوع کی کتابوں کا جائزہ لیا، آخر میں ہم سب متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ درسی منتخبات کے مجموعوں میں سب سے بہتر ابوالحسن علی ندوی کا مرتب کردہ مجموعہ مختارات ہے، جو زبان کی اصناف اور ادب کے متنوع نمونوں کا سب سے جامع مجموعہ ہے''۔(۲۶)

برصغیر میں اس کتاب کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ علی گڑھ، الہ آباد، حیدر آباد، دہلی اور لکھنؤ کی بڑی بڑی جامعات نے اس کو اپنے عربی کے نصابات میں شامل کیا۔ اور بعض قدیم طرز کے مدارس نے بھی اس کو شروع میں داخل نصاب کیا لیکن قدامت پرستی آڑے آئی اور جلد ہی اس کتاب کو انہوں نے اپنے نصابات سے خارج کر دیا۔ مولانا لکھتے ہیں:

''البتہ اس کو ہمارے قدیم مدارس میں بڑی مشکل سے بار ملا، اور ملا بھی تو جلد اس کو چھٹی دے دی گئی، کہ ان حلقوں کا عمل ''انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال'' کے بجائے ''انظر الی من قال ولا تنظر الی ما قال'' پر ہے''۔(۲۷)

اسی سلسلے کی دوسری کتاب آپ نے ''القراۃ الراشدہ'' لکھی۔ جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بھی بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کتاب کا اسلوب بھی مختارات ہی کا تھا کہ ہر سبق کسی دینی عظمت ہی پر مشتمل ہوتا۔ پڑھنے والا عربی زبان وادب بھی سیکھتا اور ساتھ ہی کوئی اخلاقی سبق بھی حاصل کرتا۔ اس کتاب کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں۔

''کتاب میں اس کا التزام ہے کہ حتی الامکان کوئی سبق دینی موعظمت سے خالی نہ ہو

اور آخر میں اس کا کوئی اخلاقی و دینی نتیجہ نکلتا ہو یا کسی دینی تعلیم یا ادب کی طرف رہنمائی کرتی ہو، لیکن اس طرح کے طالب علم کو محسوس نہ ہو کہ کوئی چیز اوپر سے یا باہر سے لائی جا رہی ہے، یا اس کو کوئی خارجی انجکشن دیا جا رہا ہے''۔(۲۸)

اسی سلسلے کی تیسری کڑی آپ کی کتاب ''قصص النبیین'' ہے۔ان کتب کو بڑے بڑے علماء کی طرف سے خوب پذیرائی ملی۔حتی کہ عالم اسلام کے معروف ادیب ومفسر سید قطبؒ نے ان پر بسیط مقدمہ لکھا اور مولانا کی کاوش کو خوب سراہا۔مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اس سلسلے کو بچوں کا علم کلام قرار دیا۔عرب وعجم کی جامعات میں اس کتاب کو بڑی پذیرائی ملی۔لیکن قدیم مدارس کے قدیم ذہن حضرات نے پھر ان کو قبول نہ کیا۔اس بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

''اگر مصنف کو اپنی کسی کتاب کے داخل نصاب نہ ہونے پر استعجاب اور دوستانہ شکوہ ہوسکتا ہے تو اس کتاب پر کہ وہ زبان آموزی اور دینی تلقین کا بیک وقت کام کرتی ہے لیکن جماعتی اور مدرسی عصبیت بڑے بڑے حقائق پر پردہ ڈال دیتی ہے، تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس بارے میں جدید تعلیمی ادارے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ فراخ دل اور وسیع النظر واقع ہوا ہے''۔(۲۹)

مذکورۃ الصدر پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا ندوی کے احترام اور علمی رفعت کے باوجود قدیم ذہن علماء صرف ان کو اس لیے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے کہ مولانا کا تعلق ایک خاص قسم کے نکسالی علماء سے نہیں ہے۔جو محدود ذہن کے حامل ہیں اور ہر عالم کو اور اس کی ہر کاوش کو ایک خاص ہیئت کی خاص شیشوں والی عینک سے دیکھنے کو اسلام کی خدمت قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک وہی شخص عالم ہے جو ان کے جامعات اور خاص طرز حیات کو ہی اسلام قرار دے۔ان کی فکر کے باہر کا ہر عالم، نہ عالم ہے، نہ اس کی کوئی بات قابل التفات ہے۔جو ان کی فکر کے مطابق نہ ہو، خواہ وہ کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو۔

برصغیر کے معروف ادیب وعالم مولانا عبدالعزیز میمنؒ نے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے فرمایا۔

''عربی زبان پر لکھنے کی جو قدرت مولانا علی میاں کو حاصل ہے وہ ہندوستان میں کسی کو

میسر نہیں''۔(۳۰)

لیکن یہ خراج تحسین بھی مولانا کے حق میں کچھ وقعت نہیں رکھتا کیوں کہ مولانا عبدالعزیز میمن بھی وہ ٹکسالی عالم نہیں ہیں جن کو قدیم علماء اصل عالم تسلیم کرتے ہیں۔

مولانا کی کتب کتنی ہی پائے کی ہوں، لیکن قدامت پسند مدارس کے ذمہ داران کو قبول نہ کرتے تھے۔اس بات کا احساس مولانا کو شدت سے تھا، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تم نے ہماری نصابی کتابوں کے لیے عربی مدارس میں جاری کرنے کی کوشش کی اور اچھا کیا۔لیکن مدارس کے جمود اور قدامت پرستی سے کم امید ہے کہ وہ اس کو قبول کریں گے۔کم سے کم قصص النبیین کو تو ضرور داخل نصاب کرنا چاہیئے کہ اس کا کوئی بدل نہیں، امید ہے کہ وہ اشتہار تمہارے پاس ہوگا جو ہم نے اس کے تعارف میں لکھا تھا، مولانا سمیع الحق صاحب نے تائیدی تحریر لکھی یہ ان کی خوبی اور تعلق کی بات ہے اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔(۳۱)

اسی حوالے سے ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''نصاب کے مسئلے میں تم جو کوشش کر رہے ہو وہ بہت مفید اور نتیجہ خیز ہے۔اللہ تعالیٰ مدارس میں اس ضرورت کا احساس اور اس نصاب کی قدر کا جذبہ بلند فرمائے۔ (۳۲)

تزکیہ نفس دین کی اصل ہے۔اس کے لیے صحبت صالح اور تعلق کاملین صالحین نہایت ضروری ہے۔مولانا خود بھی اس کی پابندی کرتے۔اس حوالے سے آپ نے مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے باقاعدہ بیعت کی، آپ مختلف اسفار میں مہینوں ان کے ہمراہ رہتے۔راقم نے خود فیصل آباد میں ان کو حضرت رائے پوری کی خدمت میں مہینوں قیام پذیر دیکھا۔آپ کو حضرتؒ کی خدمت میں اسطرح بیٹھے دیکھا جس طرح طالب علم استاذ کی خدمت میں بیٹھتا ہے یا سائل کسی سخی سے کچھ طلب کرتا ہے۔

علامہ ندویؒ اس بات کی تلقین اپنے تعلق والوں کو بھی کرتے تھے۔مولانا فضل ربی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تم نے عبادات میں سستی کے متعلق کہا ہے، اس کے لیے مناسب ہے کہ تم مولانا ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب عارفی کی خدمت میں کبھی کبھی جایا کرو، نیز کراچی کے تبلیغی مرکز میں

جمعرات کے دن پہنچنے اور رات گذارنے کی کوشش کیا کرو۔ ان شاء اللہ اس کا اثر محسوس کرو گے ''۔(۳۳)

مولانا اپنے متعلقین کی پریشانی سے اثر لیتے اور اس پریشانی سے نکالنے کی تدبیر کرتے تھے۔ جن میں دو باتوں کی نصیحت عموماً فرماتے تھے۔ ایک درود شریف کی کثرت دوسرے اہل اللہ کی صحبت، مولانا فضل ربی کو لکھتے ہیں:

''تم پر اللہ تعالیٰ کے اتنے انعامات ہیں کہ تمہیں ذہنی طور پر پریشان اور مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ پاکستان میں اللہ تعالیٰ تم سے تبلیغ و دعوت کا ایسا بیش قیمت کام لے رہا ہے کہ تمہیں اس کی قدر و منزلت کا اندازہ نہیں۔ چوں کہ اس کام کی نسبت ہماری طرف ہے اس لیے ہم اس کو زیادہ سراہ نہیں سکتے ورنہ وہ اتنا بڑا کام ہے کہ تم اس کے شکر سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ذہنی پریشانی دور کرنے کے لیے تم درود شریف کی کثرت کرو اور ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب کے پاس جا کر کچھ دیر بیٹھا کرو''۔(۳۴)

مولانا ندوی احسان و مروت کو یاد رکھتے تھے، مولانا کا آنکھ کا آپریشن امریکہ میں ہوا تھا۔ پروفیسر انیس صاحب نے تعاون فرمایا تھا، اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد میں ہمارے ایک کرم فرما اور محسن دوست پروفیسر انیس احمد صاحب ہیں۔ جنہوں نے امریکہ میں آنکھ کے اپریشن میں بڑی دلچسپی تھی۔ ان کو ہماری کتابیں نہیں پہنچیں، یہاں سے بھیجنا مشکل ہے، ان سے رابطہ کر کے مطلوبہ کتابیں مہیا کر دو''۔ (۳۵)

حضرت ندویؒ اپنے متعلقین اور انکی ضروریات کا پورا خیال رکھتے تھے حتی کہ ایسی ضرورت بھی جو بظاہر ناپسندیدہ ہی کیوں نہ ہو۔ مولانا عبدالجلیل ڈھڈیاں ضلع سرگودھا کے باسی ہیں اور مولانا عبدالقادر رائے پوری کے قریبی عزیز ہیں۔ جبکہ حضرت رائے پوری مولانا ندوی کے مرشد ہیں۔ اسی ناتے میں مولانا عبدالجلیل آپ کے لیے محترم ٹھہرے۔ ندویؒ ان کے لیے تمباکو بھیجنے کا اہتمام فرماتے۔ تمباکو مولانا عبدالجلیل کو مرغوب تھا۔ چنانچہ آپ مولانا فضل ربی ندوی کو لکھتے ہیں۔

''اگر تم کو مولانا عبدالجلیل صاحب کو بھیجنے کے لیے تمباکو کا ڈبہ دیا جائے، تو کسی معتبر آدمی کے ہاتھ ڈھڈیاں ضلع سرگودھا بھیجنے کی کوشش کرنا، رمضان المبارک ہی میں پہنچ جائے''۔(۳۶)

مولانا ندوی سے لوگ فرمائش کرتے کہ ان کی کتاب پر مقدمہ لکھیں۔ مولانا کبھی ایسی کتاب پر سرسری نظر ڈال کر مقدمہ نہ لکھتے بلکہ ان کی عادت تھی کہ اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے پھر رائے قائم کر کے بلاکم وکاست مقدمہ تحریر فرماتے۔ لکھتے ہیں:

''میں اس وقت ایسے حال میں نہیں ہوں، کہ کسی کتاب کو پڑھ کر اس پر مبسوط مقدمہ لکھ سکوں، اور کتاب کے موضوع کے لحاظ سے سرسری اور چلتا ہوا مقدمہ مناسب نہیں ہے۔'' (۳۷)

کتاب کا وجود دو افراد کا رہن منت ہوتا ہے۔ ایک مصنف دوسرے طابع و ناشر دونوں مختلف مذاق رکھتے ہیں۔ مصنف کی خواہش اپنی تحریر کی پذیرائی اور دوسرے درجے میں کسی قدر مالی منفعت ہوتی ہے۔ جبکہ طابع و ناشر کی سوچ مالی منفعت تک ہی محدود ہوتی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مصنف بھی تھے اور طابع و ناشر بھی۔ لیکن دونوں حوالوں سے آپ کا مطمع نظر مذکور الصدر دونوں خواہشات سے عاری تھا۔ آپ کے لیے قلمکاری اور طباعت کتب کا صرف ایک ہی محرک تھا۔ جو اعلائے کلمۃ اللہ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ہر معاملہ میں آپ کی یہی سوچ اور یہی فکر ہوتی تھی۔ آپؒ زندگی بھر قلم کے ذریعہ دنیا میں پھیلی ظلمت کے خلاف نبرد آزما رہے۔ اور علم کی روشنی پھیلاتے رہے۔ اس معاملے میں آپ کا عمل لانرید منکم جزاء ولا شکورا پر تھا۔ آپ نے فرمایا ''لکھنا ہماری طبیعت ثانیہ بن گیا ہے''۔ رضوان علی ندوی لکھتے ہیں۔

''جس طرح کوئی انسان اپنی اولاد کی نگہداشت کرتا ہے اسی طرح مولانا کو کتاب کی عمدہ اور صحیح طباعت اور اسکی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی فکر رہتی تھی، دیگر مصنفین کی طرح کتاب کی مالی منفعت مولانا مرحوم کا مطمع نظر کبھی نہیں رہا۔ اپنے ۵۳ سالہ تعلق کی بنا پر میں اس کا شاہد ہوں اور میری طرح کتنے ہی دوسرے مولانا کے متعلقین اس کے گواہ ہیں، کتنے ہی ناشروں نے ہندوستان و پاکستان اور بیروت و دمشق و مصر وغیرہ میں مولانا مرحوم کی کتابیں مسروقہ طور پر

چھاپ کر لاکھوں روپے کمائے، مگر مولانا نے ان سے کبھی تعرض نہیں کیا''۔(۳۸)

اسی حوالے سے مولانا لکھتے ہیں:

''میری تصنیفات پاکستان میں خوب پھیل گئی ہیں اور اہل ذوق نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ اکثر جلسوں میں حاضرین خاص طور پر نوجوان کوئی نہ کوئی کتاب لیے کھڑے ہوتے تھے اور اس پر دستخط کرنے کی فرمائش کرتے تھے اور مجھے فطری طور پر یہ دیکھ کر خوشی اور اطمینان ہوا کہ ان کتابوں کی اشاعت اس ملک میں اتنے وسیع پیمانے پر ہوئی جتنی شاید ہندوستان میں بھی نہیں ہوئی''۔(۳۹)

''ہم بہت عرصہ سے اس کی سخت ضرورت محسوس کرتے تھے، کہ منظم اور ذمہ دارانہ طریقہ پر ہماری کتابیں اور مجلس کی اہم مطبوعات پاکستان میں طبع ہوں، اور ان کی ان حلقوں میں اشاعت ہو، اور وہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچیں، جو خاص طور پر ان کتابوں کے مخاطب ہیں۔ ہماری بہت سی کتابیں ایسی ہیں، جن کی اشاعت کی وہاں زیادہ ضرورت اور افادیت ہے، لیکن ابھی تک کوئی ایسا ذمہ دار ناشر نہیں ملا، جو اس کو ایک مقصد اور ایک اہم دینی خدمت کے طور پر انجام دے، اور اس کا ذہن بقدر ضرورت تاجرانہ کے ساتھ داعیانہ ہو، اگر تم اس کام کے لیے تیار ہو۔ اور تم اس کو ایک اہم خدمت سمجھتے ہو تو ہم تم کو دوسروں پر کھلی ترجیح دیں گے، اور ہم کو اس سے زیادہ خوشی ہوگی، تم بھی اس طرح اس حق کو ادا کرسکو گے جو ہمارا تمہارے اوپر عائد ہوتا ہے۔''(۴۰)

یہ بات پہلے بھی لکھی جا چکی ہے کہ مولانا کی تصنیف و تالیف اور کتب کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ مالی و مادی منفعت کا تصور تو دور دور تک بھی نہ تھا۔ اگر مادی منفعت پیش نظر ہوتی تو مولانا شاہ فیصل ایوارڈ کی رقم کبھی تقسیم نہ فرماتے۔ حالانکہ وہ لاکھوں میں تھی۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
شاعری کچھ باعث عزت نہیں مجھے

''ایک اور خط میں مولانا فضل ربی ندوی کو لکھتے ہیں:

کتابوں کی اشاعت کا کام دین کی اہم خدمت اور وقت کی دعوت و جہاد سمجھ کر کرو۔

اگر نیت درست رہی تو آخرت میں اس کا اجر دیکھو گے۔ہم حیدر آباد آئے ہیں وہیں سے یہ خط لکھ رہے ہیں''۔(۴۱)

اسی طرح ایک اور خط میں۔فضل ربی ندوی کو لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ تم سے کتابوں کی نشرواشاعت کا جو کام لے رہا ہے وہ بہت اہم ہے۔اور تمہیں اس پر شکر کرنا چاہیے۔یہ تمہاری بہت بڑی عبادت اور جہاد ہے۔تم کبھی اس کی افادیت میں شک نہ کرنا''(۴۲)

جملہ مساعی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہیں:

''ابھی تک ''تاریخ دعوت عزیمت'' کے پریس سے باہر آنے کی اطلاع نہ ملنے پر بڑا تعجب ہے،لیکن خیال ہے معلوم نہیں اتنی غیر معمولی دیر کیوں ہوئی؟ جب نگینہ تیاز ہوں تو یہاں دو ہفتے میں کتاب چھپ جاتی ہے،انتشار انگیز اور تخریبی کوششیں اور لٹریچر تو ہوائی جہاز کی رفتار سے چل رہا ہے،اور اہل حق کی محنتیں چیونٹیوں کی چال''۔(۴۳)

اگر چہ قلم وقرطاس آپ کی طبیعت ثانیہ تھی،اور تحقیقی ذہن رکھنے والا شخص اپنی ذہنی میلان کی وجہ سے کسی اور طرف مبذول نہیں کرسکتا۔اس کے باوجود مولانا خط کے معاملے میں تساہل کا شکار نہ ہوتے۔آپ کی ڈاک بھی کم نہ ہوتی۔پوری دنیا سے خطوط آتے۔آپ ہر ایک کا جواب لکھتے یا لکھواتے۔کبھی ایسا نہ ہوا کہ کسی نے خط لکھا ہو اور آپ نے بروقت جواب نہ دیا ہو۔

کسی مطلوب کے بارے میں فریق ثانی کی طرف سے جواب نہ ملے تو بے چین ہوتے، آپ نے بہت سے خطوط فضل ربی ندوی کو لکھے جواب طبع بھی ہو چکے ہیں۔انہی خطوط میں سے بیشتر خطوط میں مولانا شاکی ہیں کہ فضل ربی کی طرف سے جواب بروقت نہیں ملتا۔یہ شکایت ایک دو خطوط میں نہیں بلکہ بہت سے خطوط میں ملتی ہے۔اپنی اس شکایت کا اظہار آپ ادیبانہ انداز میں کرتے ہیں۔اور کہیں کہیں اشعار کا سہارا بھی لیتے ہیں۔جو آپ کے ذوق شعری کا آئینہ دار ہے۔ایک خط کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''عزیز القدر مولوی فضل ربی ندوی سلمہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خاموشی تیری سب کے جواب میں

مولانا اپنے علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ خطوط کے جواب بڑی ہی پابندی سے دیتے تھے۔ لکھنے والے کی طرف سے کوتاہی ہوتی لیکن آپ کی طرف سے نہیں۔ خطوط کے جوابات لکھنے میں آپ کا اہتمام اس قدر تھا کہ کوئی مشغولیت اس میں آڑے نہ آتی حتیٰ کہ سفر کے دوران ترسیل ڈاک کا سلسلہ جاری رہتا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''یہ خط دہلی کے ہوائی اڈے پر عجلت میں لکھ رہا ہوں''

ایک اور خط میں فرماتے ہیں:۔

یہ معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا کہ ہم نے دہلی کے ہوائی اڈے سے رسالہ پندرویں صدی کا جو تکملہ بھیجا تھا وہ تم کو پہنچ گیا اور اس کی کتابت بھی ہوگئی''۔(۴۵)

''ہم جنوبی ہند کے طویل دورے پر تھے واپس آئے تو بحرانی طور پر مصروف ہو گئے ،ڈاک کا انبار تھا جس سے ابھی تک فرصت نہیں ہوئی ،تمہارے خط کے مندرجات کا نمبر وار جواب دیتے ہیں''۔(۴۶)

ایک عزیز کو لکھتے ہیں:

''تمہیں چند سطریں رات کے وقت اپنے قلم سے لکھ رہے ہیں کئی بار یہ خیال آیا کہ شاید ہماری کوئی بات تم کو ناگوار گزری۔ تم نے سکوت اختیار کر لیا اور احتجاجاً خط و کتابت بند کر دی، جہاں تک ہمارا تعلق ہے بقول شاعر:

ما قصہء سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ہمارا تم سے تعلق کاروباری و تجارتی نہیں ہے، دینی و دعوتی ہے، خط لکھو، اگر نئی کتابوں کی طباعت میں کچھ دشواری ہے تو حرج نہیں معلوم ہونا چاہیے،'' حدیث پاکستان ''، ''تحفہ پاکستان'' کی خوب اشاعت کرو'' کاروانِ زندگی'' کا حصہ دوم شائع ہو جاتو تا اچھا تھا۔(۴۸)

مولانا نے ۱۹۱۴ء میں اس جہانِ آب وگل میں قدم رکھا اور ۲۰۰۰ء میں اس جہانِ فانی سے دارِ آخرت کی طرف سدھارے۔ آپ کی زندگی کے چھیاسی برس کا ایک ایک لمحہ ایک ایک ساعت، ایک ایک گھڑی، ایک ایک دقیقہ اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے، صرف ہوا۔ آپ زندگی بھر اسی کام کے لیے جیے اور اسی کام کو کرتے ہوئے جان جاں آفرین کے سپرد کی۔ آپ نے اپنی علمی، قلمی، جسمانی اور روحانی تمام صلاحیتیں صرف اور صرف اسلام اور اشاعت اسلام کے لیے صرف کیں۔ آپ کی ساری زندگی اس شعر کی آئینہ دار تھی:

تا نہ آمد بانگ حق از عالمے
گر مسلمانی نیاسائی دمے

☆.....☆

حوالہ جات وحواشی

۱۔ سہ ماہی کاروانِ ادب لکھنؤ، ص ۱۳
۲۔ سہ ماہی کاروانِ ادب لکھنؤ، ص ۱۳
۳۔ سہ ماہی کاروانِ ادب لکھنؤ، ص ۴۷
۴۔ کاروانِ زندگی، ص ۱۲۱

۵۔ کاروانِ زندگی ،ص ۵۱۔۵۲۔۵۳

۶۔ کاروانِ زندگی ،ص ۵۳

۷۔ کاروانِ زندگی ،ص ۱۲۲

۸۔ کاروانِ زندگی ،ص ۱۲۲۔۱۲۳

۹۔ کاروانِ زندگی ،ص ۶۵

۱۰۔ کاروانِ زندگی ،ص ۶۸۔۶۹

۱۱۔ کاروانِ زندگی ،ص ۵۷

۱۲۔ کاروانِ زندگی ،ص ۶۵

۱۳۔ کاروانِ زندگی ،ص ۶۸

۱۴۔ کاروانِ زندگی ،ص ۵۸۔۵۹

۱۵۔ کاروانِ زندگی ،ص ۵۹

۱۶۔ کاروانِ زندگی ،ص ۲۶۳

۱۷۔ کاروانِ زندگی ،ص ۹۹۔۱۰۰

۱۸۔ کاروانِ زندگی ،ص ۱۲۰

۱۹۔ کاروانِ زندگی ،ص ۱۰۸

۲۰۔ کاروانِ زندگی ،ص ۱۰۵

۲۱۔ کاروانِ زندگی ،ص ۱۰۵

۲۲۔ سہ ماہی کاروانِ ادب لکھنؤ،ص ۱۰۴

۲۳۔ مولانا کے خطوط ،ص ۷۵

۲۴۔ مولانا کے خطوط ،ص ۷۷

۲۵۔ مولانا کے خطوط ،ص ۱۱۰

۲۶۔ کاروانِ زندگی ،ص ۲۱۱۔۲۱۳

۲۷۔ سہ ماہی کاروانِ ادب لکھنؤ ،ص ۵۶

۲۸۔ سہ ماہی کاروانِ ادب لکھنؤ ،ص ۵۶

۲۹۔ سہ ماہی کاروانِ ادب لکھنؤ ،ص ۵۸

۳۰۔ سہ ماہی کاروانِ ادب لکھنؤ ،ص ۶۴

۳۱۔ مولانا کے خطوط ،ص ۶۵

۳۲۔ مولانا کے خطوط ،ص ۶۹

۳۳۔ مولانا کے خطوط ،ص ۵۸

۳۴۔ مولانا کے خطوط ،ص ۲۵

۳۵۔ مولانا کے خطوط ،ص ۹۵

۳۶۔ مولانا کے خطوط ،ص ۱۰۹

۳۷۔ مولانا کے خطوط ،ص ۷۴

۳۸۔ مولانا کے خطوط ،ص ۸۔۹

۳۹۔ مولانا کے خطوط ،ص ۱۳

۴۰۔ مولانا کے خطوط ،ص ۱۵

۴۱۔ مولانا کے خطوط ،ص ۶۳

۴۲۔ مولانا کے خطوط ،ص ۲۷

۴۳۔ مولانا کے خطوط ،ص ۸۹

۴۴۔ مولانا کے خطوط ،ص ۵۱۔۵۲

۴۵۔ مولانا کے خطوط ،ص ۵۹

۴۶۔ مولانا کے خطوط ،ص ۶۰

۴۷۔ مولانا کے خطوط ،ص ۸۳

۴۸۔ مولانا کے خطوط ،ص ۹۵

☆.....☆

میری سو اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی :

''علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ، اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو، اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو تو ان مردوں پر نظر کرو، جنہوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گزار دی، ان کے مرتبے کیا تھے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ، مولوی محمد ابراہیم صاحبؒ (اس سے مراد مولانا ابومحمد ابراہیم صاحب آروی مشہور اہل حدیث عالم ہیں جو مولانا کے نانا سید شاہ ضیاء النبی صاحبؒ کے مرید اور ربانی حقانی عالم تھے) اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحبؒ (حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ) اور مولوی محمد امین صاحب (حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب کے خلیفہ) جن کی زندگی اور موت اس وقت قابل رشک ہوئی، کس شان وشوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی، یہ مرتبے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔

انگریزی مرتبے والے تمہارے خاندان میں بہت ہیں اور ہوں گے، مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں۔

علی! اگر میری سو اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک نام ہوں اور صاحب اولاد کہلاؤں۔ آمین ثم آمین یارب العالمین''۔

(مولانا علی میاں کی والدہ ماجدہ محترمہ خیر النساء کا مولانا کے نام خط)